آخری صلیبی جنگ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲/ستمبر ۲۰۰۵ء کا خطابِ جمعہ

بمقام قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور

ترتیب و تلخیص : **کلیم اللہ**

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ۘؔ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے‘ آج مجھے آخری صلیبی جنگ کے موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ موضوع انتہائی اہم بھی ہے اور اس میں ہمارے لیے غور وفکر کا بہت سا سامان بھی موجود ہے۔

گفتگو کے آغاز میں چند بنیادی باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ اصطلاح یعنی ’’آخری صلیبی جنگ‘‘ جو میں نے استعمال کی ہے‘ میری نہیں ہے‘ بلکہ عیسائیوں کے ایک فرقے Baptists کی ہے‘ جو کہ پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں اور ان میں سے بھی جو اَخص الخواص ’’Evangelists‘‘ ہیں‘ ان کے میگزین Trumpet میں ’’The Last Crusade‘‘ کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس مقالے کا ایک ٹکڑا کچھ یوں ہے:

"Most people think the crusades are a thing of the past- over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all!"

’’بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں ماضی کی بات ہے اور ختم ہو چکی ہیں‘ لیکن ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں جاری ہیں اور یہ انتہائی خونی جنگ ہو گی‘‘۔

اس مضمون کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ انسانی کو تین ادوار میں تقسیم کرنا ہو گا:

۱) پہلا ملینیم ۔۳۰ء سے ۱۰۰۰ء تک

۲) دوسرا ملینیم ۔۱۰۰۱ء سے ۱۹۹۹ء تک

۳) تیسرا ملینیم ۔۲۰۰۰ء سے جو اَب تک جاری ہے۔

یہاں پر یہ واضح رہے کہ ملینیم کی اصطلاح جو عیسائی اور یہودی استعمال کرتے ہیں' وہ آسمانی کتابوں کے عین مطابق ہے۔قرآن مجید میں دو بار ارشاد ہوا کہ ''اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار برس پر محیط ہے۔'' سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں:

﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''اور ایک دن تمہارے ربّ کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو''۔

اسی طرح سورۃ السجدۃ میں ارشاد ہوا:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾

''وہ تدبر سے اُتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک' پھر چڑھتا ہے وہ کام اُس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں''۔

پہلے ملینیم کے آغاز پر صورت حال یہ تھی کہ یروشلم جو کہ یہودیوں کا شہر تھا اور یہاں وہ ایک عرصے سے آباد تھے' یہیں پر ان کا ہیکلِ سلیمانی (Solomon's Temple) بھی تھا' جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا اور ۵۸۷ ق م میں اسے عراقی بادشاہ بخت نصر (Nebukadnezar) نے منہدم کر دیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔اسے انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا تھا' لیکن ۷۰ء میں طیطس (Titus) نامی ایک رومی جرنیل نے حملہ کیا جس میں یہودیوں کو بڑی خوفناک شکست ہوئی۔اس قدر خون ریزی ہوئی کہ ٹائٹس رومی نے صرف ایک دن میں کم وبیش ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور جو Second Temple انہوں نے تعمیر کیا تھا وہ بھی مسمار کر دیا۔یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہودیوں کے نزدیک ہیکلِ سلیمانی کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے نزدیک کعبہ کی ہے اور ۱۹۳۵ برس ہونے کو آئے ہیں لیکن ان کا یہ کعبہ آج تک گرا پڑا ہے۔بہرحال ٹائٹس رومی کے ہاتھوں قتل عام کے بعد جو یہودی بچ گئے انہیں فلسطین کے علاقے سے نکال دیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا اور یروشلم یہودیوں سے کُلی طور پر خالی ہو گیا۔فلسطین سے انخلاء کے اس دَور کو یہودی بجا طور پر اپنا ''دورِ انتشار'' (Diaspora) کہتے ہیں۔

اس واقعہ کے تقریباً ۶۰۰ برس بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا' اُسی میں مسلمانوں نے یروشلم پر بھی حملہ کیا' جو اُس وقت عیسائیوں کے قبضہ میں تھا۔صورت حال یہ تھی کہ اس شہر کی فصیلیں بے انتہا اونچی تھیں اور اندر راشن بھی وافر مقدار میں موجود تھا۔چنانچہ عیسائیوں نے فصیلوں کے دروازے مقفل کر دیے اور خود اندر محصور ہو گئے۔نتیجتاً ایک طویل محاصرے کے بعد بھی مسلمانوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔اسی دوران عیسائیوں کے چند بڑے عالم فصیل پر آئے اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''تم ہزار برس تک بھی یہاں پڑے رہو گے تب بھی تمہارے ہاتھ پر یہ شہر فتح نہیں ہو گا۔ہاں ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اسے ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہونا ہے' لیکن تمہارے درمیان وہ درویش بادشاہ نظر نہیں آ رہا''۔اس بات کا پس منظر سمجھ لیجیے۔اسلام کا اوّلین دَور مسلمانوں کے لیے غربت اور افلاس کا دَور تھا۔بعد ازاں فتوحات کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اُس سے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب انہوں نے شامیوں کے سے انداز میں اچھا لباس استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔چونکہ مسلمان کافی عرصہ سے شام میں تھے لہٰذا شامی تہذیب کا اثر اُن کے رہن سہن میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

عیسائی عالموں کی بات سے امیرِ لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اَمِيْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ کا لقب ملا تھا) کو

خیال ہوا کہ ان کا اشارہ یقیناً حضرت عمرؓ کی طرف ہے۔ لہٰذا محاذِ جنگ سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک درخواست روانہ کی گئی کہ اگر آپ خود تشریف لائیں گے تو یروشلم بغیر لڑائی کے فتح ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ خود یروشلم روانہ ہوئے۔ یہ حضرت عمرؓ کا وہی تاریخی سفر ہے جو اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی روشن باب ہے۔ اس سفر میں صرف ایک سواری (اونٹ) تھی۔ راستے کے لیے راشن بھی اسی پر لدا ہوا تھا۔ لہٰذا ایک وقت میں ایک آدمی ہی اُس پر بیٹھ سکتا تھا۔ اندریں حالات ایک منزل میں خلیفہ سواری کے اوپر تشریف فرما ہوتے اور آپؓ کا خادم نکیل ہاتھ میں پکڑے آگے آگے چلتا' اگلی منزل پر خادم سواری کے اوپر بیٹھتا اور خلیفۂ وقت نکیل تھامے آگے چل رہے ہوتے۔ مساوات کا یہ عملی نمونہ تاریخ انسانی نے کم کم ہی دیکھا ہوگا۔ جب آخری منزل شروع ہوئی تو اتفاق سے سواری پر بیٹھنے کی باری خادم کی تھی۔ اُس نے بہت اصرار کیا کہ آپؓ اونٹ پر بیٹھ جائیے' لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں! باری تمہاری ہے' لہٰذا تمہیں ہی اونٹ پر بیٹھنا ہوگا۔ لہٰذا جب یروشلم میں داخل ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ خلیفۂ وقت جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوان کانپتے تھے' اس شان سے چلے آرہے ہیں کہ ایک ہاتھ میں اُونٹ کی نکیل ہے اور دوسرے ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے ہیں' جبکہ خادم سواری کے اوپر بیٹھا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے آپؓ کا استقبال کیا اور اسی طرح سیدھے آپؓ کو فصیل کے قریب لے گئے اور عیسائیوں کو پکار کر کہا کہ یہ ہیں ہمارے خلیفہ! عیسائیوں نے اپنی کتابوں کے مطابق جو نشانیاں ملائیں تو اس بات پر صاد کیا کہ یہی وہ بادشاہ ہیں جن کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہونا ہے۔ لہٰذا فصیل کے دروازے کھول دیے گئے۔ مسلمان افواج اندر داخل ہوگئیں اور یروشلم بغیر کسی لڑائی کے مسلمانوں نے فتح کر لیا۔

اس موقع پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے وقت عیسائیوں کا یہ مطالبہ مان لیا گیا کہ مسلمان یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ طے فرما دیا کہ یروشلم یہودیوں کے لیے کھلا شہر (open city) تو ہو گا' تاکہ وہ یہاں آ کر اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں' لیکن نہ تو وہ یہاں آباد ہو سکیں گے اور نہ ہی کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں گے۔ یہ تو تھے وہ اہم واقعات اور حالات جو پہلے ملینیم کے دوران پیش آئے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم پہلے ملینیم کے اختتام پر اُس واقعہ کی طرف بڑھتے ہیں جو کہ انتہائی اہم ہے' اور وہ واقعہ تھا پورے عالم عیسائیت کا اتحاد۔ یہاں پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اس واقعہ سے پیشتر عیسائی دنیا کئی سو برس سے دو حصوں میں منقسم تھی۔ مذہبی اعتبار سے اٹلی' فرانس' جرمنی' سپین اور انگلستان کے علاقوں پر مشتمل عیسائیت مغربی عیسائیت کہلاتی تھی' جس کا سربراہ پوپ تھا اور اس کا صدر مقام روم (رومۃ الکبریٰ) تھا۔ اس کے برعکس دوسرا حصہ جو جنوب مشرقی یورپ اور مشرقی یورپ کے عیسائی ممالک پر مشتمل تھا' یہاں کی عیسائیت مشرقی عیسائیت کہلاتی تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔ بہرحال دونوں حصوں کے اتحاد کے بعد پوپ کو عیسائی دنیا کے مرکزی رہنما کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

دوسرے ملینیم کے شروع ہونے کے ٹھیک ۹۵ برس بعد یعنی ۲۰ نومبر ۱۰۹۵ء کو اُس وقت کے پوپ اربن ثانی (Urban-II) نے فرانس کے ایک شہر Clermont میں ایک انتہائی اہم خطاب کیا' جس میں اُس نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ''ہمارا یہ اہم ترین مذہبی فریضہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جہاد کریں اور ان سے اپنے مقدس مقامات چھین لیں۔'' کیونکہ پہلے ملینیم کے اختتام پر فلسطین اور شام کے علاقے بشمول یروشلم مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ اس علاقے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

Too small a geography but too big a history.

اس کی وجہ سمجھ لیجیے کہ اس علاقے میں تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات ہیں۔ اسی اہمیت کی وجہ سے یہاں تصادم بھی بڑا شدید ہوا۔

بہرحال پوپ اربن ثانی کی مذکورہ بالاتقریر سے عیسائی دنیا میں ایک آگ لگ گئی۔ چنانچہ پورے یورپ پر مشتمل ایک بہت بڑی فوج تیار کی گئی' جس میں قائدانہ کردار فرانس اور جرمنی کا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے اور اس طرح باقاعدہ طور پر جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس جنگ (war) کا سلسلہ ۱۰۹۷ء سے شروع ہو کر ۱۲۹۱ء تک تقریباً ۱۹۴ برس جاری رہا۔ واضح رہے کہ جنگ (war) اور لڑائی (battle) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک جنگ کئی لڑائیوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ یعنی جنگ تو مسلسل جاری رہتی ہے' اس کے اندر بے شمار لڑائیاں اور معرکے ہوتے رہتے ہیں' کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر۔ عام طور پر ہم جنگ کا لفظ بھی لڑائی کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ بہرحال اس طویل جنگ کے دوران سینکڑوں لڑائیاں (battles) ہوئیں' لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی بڑی جنگیں بھی ۹ یا ۱۳ کی تعداد میں ہوئیں۔ ان جنگوں کو عیسائیوں نے صلیبی جنگوں (The Crusades) کا نام دیا تھا۔

صلیبی جنگوں کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دَور ۱۰۹۷ء سے لے کر ۱۱۴۴ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں عیسائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا' کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ اگر اس مقدس جنگ میں تمہاری جان بھی چلی گئی تو تم سیدھے جنت میں جاؤ گے اور تمہارے تمام گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ جہاد کے ضمن میں آج مسلمانوں کو جس طرح بدنام کیا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ قابل مذمت جہاد کا وہ نعرہ تھا جو پوپ اربن ثانی نے ۱۰۹۵ء میں لگایا تھا۔ بہرحال لاکھوں کی تعداد میں عیسائی افواج ایشیا کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں جو بستیاں بھی آئیں وہ لوٹ لی گئیں۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ رکھیے کہ عیسائیوں کا اصل ہدف تو وہ مسلمان تھے جن کے علاقوں میں ان کے مقدس مقامات تھے اور ان علاقوں کو مسلمانوں سے بازیاب اور واگزار کرانا ان کا ہدف تھا' لیکن ساتھ ہی عیسائیوں کو یہودیوں پر بھی بے پناہ غصہ تھا' جو حضرت مسیح علیہ السلام کو نعوذ باللہ ولدُ الزنا' جادوگر اور شعبدہ باز کہتے تھے۔ چنانچہ اندازہ کیجیے کہ ان کے بارے میں عیسائیوں کے غیظ وغضب کا کیا عالم ہو گا جو حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا' الوہیت میں شریک بلکہ خدا تک مانتے ہیں! بہرحال ان لڑائیوں میں جہاں مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا وہاں اَن گنت یہودی بھی مارے گئے۔ جو یہودی بستی بھی راستے میں آئی لوٹ لی گئی اور وہاں خوب قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ گویا اس صلیبی جنگ میں مسلمان اور یہودی زیرِ عتاب (persecuted) ہونے کے اعتبار سے یکجا (bracketted) تھے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ جب یہ واقعات پیش آ رہے تھے عالم اسلام پر اُس وقت بنوعباس کی حکومت تھی' جو اگرچہ قانونی طور پر مرکزی حکومت کہلاتی تھی' لیکن بنوعباس اُس وقت کافی کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی سلطنت کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے حکمران پیدا ہو چکے تھے۔ کہیں سلجوقی' کہیں بربر' کہیں ممالیک اور کہیں کوئی اور تھے' اور سب کی اپنی خودمختار حکومتیں تھیں۔ عباسی خلیفہ تو بس ایک علامت (symbol) تھا جس کی آشیرواد حاصل کر کے وہ اپنی حکومت کے لیے سندِ جواز لیتے تھے۔ اِن حالات میں مسلمان کمزوری کی بنا پر اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے' نتیجتاً ان کے خلاف عیسائیوں کو بے شمار فتوحات حاصل ہوئیں۔ بحیرۂ روم (Mediterranean) کے ساحلی علاقوں میں' جن میں شام' فلسطین اور مصر کے علاقے بھی شامل تھے' عیسائیوں نے زبردست لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور ان علاقوں کو فتح کر کے چار آزاد عیسائی ریاستیں قائم کیں۔

ان جنگوں کا دوسرا دَور ۱۱۴۴ء سے ۱۱۹۶ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں مسلمانوں کے اندر کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ اسی دوران میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑے مجاہد اور غازی سلطان صلاح الدین ایوبی عیسائیوں کے مقابلے میں آئے اور ۱۱۸۷ء میں انہوں نے صلیبیوں کو شکست دے کر انہیں یروشلم سے نکالا اور وہاں اسلامی حکومت قائم کر دی۔ واضح رہے کہ یروشلم صلیبی جنگ کے پہلے دَور (۱۰۹۹ء) میں عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۸۸ برس بعد اسے واگزار کروایا۔ اسی دوران میں مسلمانوں نے اپنے کچھ مزید علاقے بھی بازیاب کروا لیے۔

ان جنگوں کا تیسرا دَور ۱۱۹۶ء سے ۱۲۹۱ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصے میں عیسائیوں کی طرف سے یروشلم دوبارہ فتح کرنے کے لیے پے در

پے کوششیں ہوئیں۔ کبھی جرمنی‘ کبھی فرانس اور کبھی دیگر یورپی طاقتوں کی طرف سے فوج کشی کی گئی۔ ایک موقع پر رچرڈ شیر دل (Richard, the Lion hearted) جو اُس وقت انگلستان کا بادشاہ تھا‘ خود فوج لے کر آیا‘ لیکن اسے بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی اور وہ مجبوراً صلح کر کے واپس چلا گیا۔

اسی دوران میں ایک مرحلے پر سلجوقی بادشاہ الملک کامل کے دَور میں صلیبیوں نے پھر حملہ کیا اور وہ مقابلہ نہ کر سکا‘ لہٰذا اُس نے معاہدہ کر کے یروشلم دوبارہ عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ یروشلم ۱۶ برس تک عیسائیوں کے زیر قبضہ رہا۔ گویا ۱۹۴ برس کی ان صلیبی لڑائیوں میں ۱۰۴ برس تک یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ بالآخر مسلمانوں نے اپنے سارے علاقے دوبارہ بازیاب کرا لیے اور ۱۲۹۱ء میں صلیبی جنگ کا یہ دَور اختتام پذیر ہوا۔ یہ تھا پہلی صلیبی جنگ کے دوران مختلف لڑائیوں اور معرکوں کا ایک مختصر جائزہ۔

جہاں تک دوسری صلیبی جنگ کا معاملہ ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شروع ہونے والی ہے‘ لیکن میرے نزدیک یہ پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہو چکی ہے۔ گویا اس جنگ کا آغاز ہوئے قریباً سو برس ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے‘ پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اس میں ترکی کو شکست ہوئی اور اس کے نتیجے میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے کر دیے گئے اور بالآخر خلافتِ عثمانی ۱۹۲۴ء میں کلیۃً ختم ہو گئی۔ اس جنگ کے دوران جب شام فتح ہوا اور اتحادی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو جنرل ایلن بی نے‘ جو مسلح افواج کی کمان کر رہا تھا‘ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی قبر کو ٹھوکر مار کر کہا تھا: "Saladin, We are again here!" یعنی ۱۱۸۷ء میں تم نے ہمیں شکست دی تھی اور یہاں سے نکال دیا تھا‘ لیکن اب ہم دوبارہ آ گئے ہیں اور اب دوبارہ یہاں ہمارا قبضہ ہے۔ یہ پہلا دَور تھا اس آخری صلیبی جنگ کا جس کو شروع ہوئے قریباً ۹۰ برس ہو چکے ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ جنگ عظیم اوّل کے دوران ایک بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی‘ اور وہ یہ تھی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک عرصہ سے جاری دشمنی ختم ہو چکی تھی اور اب ان کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہو چکا تھا‘ بلکہ صحیح تر معنوں میں عیسائی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اُن کے آلۂ کار بن چکے تھے۔ اس دوستی کا نتیجہ ۱۹۱۷ء کے اعلانِ بالفور (Balfour) کی صورت میں سامنے آیا‘ جس کے مطابق یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کا حق حاصل ہو گیا۔ گویا یہ ایک تحفہ تھا جو عیسائیوں نے یہودیوں کو دیا۔

جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے‘ حضرت عمر فاروق ؓ کے دورِ خلافت میں جب یروشلم مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تھا تو مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے یہودیوں کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ یروشلم میں آباد ہو سکیں یا وہاں کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں۔ اس معاہدے کی بعد میں آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں نے‘ خواہ وہ بنو اُمیہ تھے یا بنو عباس تھے یا عثمانی تھے‘ پوری طرح پابندی کی۔ حالانکہ اس دوران میں یہودیوں نے ہر طرح سے کوششیں کیں کہ وہ کسی طریقے سے یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت حاصل کر لیں۔ سلطان عبدالحمید خان (عثمانی خلیفہ) کو تو بہت بڑی رشوت پیش کی گئی کہ آپ کے ذمے تمام قرضے معاف کر دیے جائیں گے‘ اور آپ کا خزانہ جو آپ کے پیش رووں کی فضول خرچیوں کی وجہ سے خالی ہو چکا ہے اسے بھی بھر دیا جائے گا‘ لیکن عثمانی خلیفہ کا موقف تھا کہ حضرت عمر فاروق ؓ کے کیے ہوئے معاہدے میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بہر حال اعلانِ بالفور کے مطابق یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کا راستہ کھل گیا۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ریاست قائم ہو گئی اور یوں یہودیوں اور عیسائیوں کے گٹھ جوڑ پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔

عرب ممالک نے اسرائیل کے قیام پر شدید احتجاج کیا جس کے باعث اسی سال عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں عربوں کو شکست ہوئی اور انہیں بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ تقریباً ۱۹ برس بعد یعنی ۱۹۶۷ء میں مصر‘ شام اور اردن سے اسرائیل کی دوبارہ جنگ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا تینوں ممالک اکٹھے ہو کر اسرائیل کے خلاف میدان میں آئے‘ اس مرتبہ پھر انہیں اسرائیل کے ہاتھوں تباہ کن شکست سے

دوچار ہونا پڑا۔ نتیجتاً اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا' شام سے جولان کی پہاڑیاں اور اردن سے پورا مغربی کنارہ (West Bank) چھین لیا۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب دن بدن کمزور سے کمزور تر اور اسرائیل مضبوط سے مضبوط تر اور طاقتور ہوتا چلا گیا۔

اس تناظر میں اِس وقت کی صورتِ حال کے مطابق معاملات مختلف سمتوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف تو پورے یورپ کو یورپی یونین کی شکل میں دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے (جیسا پہلی صلیبی جنگ کے دوران ہوا تھا) مزید برآں نیٹو (NATO) کو بھی از سرِ نو منظّم اور وسیع کیا جا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب اس ساری activity کا مقصد کیا ہے؟ USSR تو ختم ہو چکا۔ اس مہم جوئی کا مقصد یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ''اب ہمیں مسلم فنڈامنٹلزم سے نمٹنا ہے۔''

اس ساری صورتِ حال میں رومن کیتھولکس تو چاہتے ہیں کہ پورا یورپ متحد ہو کر ایک ملک بنے جس میں ایک خالص عیسائی حکومت قائم ہو اور اس طرح آخری صلیبی جنگ کی طرف پیش قدمی ہو۔ اس ضمن میں عیسائیوں کے پیشِ نظر کیا کیا عزائم ہیں' اس کی ایک چھوٹی سی جھلک آپ کو انڈونیشیا کے جزیرہ مشرقی تیمور کے واقعات میں نظر آ جائے گی۔ مشرقی تیمور انڈونیشیا کا بہت بڑا جزیرہ تھا' جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ لہٰذا معمولی سے فساد کا بہانہ بنا کر وہاں رومن کیتھولک حکومت قائم کر دی گئی۔ اسی بنا پر پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ترجمان رسالے Trumpet (جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں آ چکا ہے) کا یہ کہنا ہے کہ پوپ جان پال سیکنڈ نے یورپ کے اتحاد کی جس طرح کوششیں کی ہیں وہ مقدس سلطنت روما (Holy Roman Empire) کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے ہیں تاکہ عیسائی صلیبی جہاد کریں اور حملہ کر کے مشرقِ وسطیٰ میں واقع عیسائیوں کے تمام مقدس مقامات مسلمانوں سے چھین لیں۔

البتہ جہاں تک پروٹسٹنٹس کا تعلق ہے وہ یہود کے ساتھ ہیں اور ان کے پیشِ نظر عظیم تر اسرائیل (Greater Israel) کا قیام ہے' جو فلسطین' عراق' شام' اردن' لبنان کے تمام علاقوں' جزیرہ نمائے سینا' مصر کے جشن کے علاقہ اور دریائے نیل کے ڈیلٹا (زرخیز شمالی علاقہ)' ترکی کے جنوبی حصے اور حجازِ مقدس کے شمالی حصے بشمول مدینہ منورہ پر مشتمل ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ جزیرہ نمائے سینا یہود کے لیے بہت مبارک اور متبرک علاقہ ہے۔ اسی میں کوہ طور بھی ہے جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام متعدد بار اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور یہیں انہیں تورات عطا کی گئی۔ مصر کا اکثر و بیشتر علاقہ بالکل بنجر اور صحرا ہے۔ صرف دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ تقریباً دس میل اِدھر اور دس میل اُدھر روئیدگی اور ہریاول ہے۔ البتہ شمال میں بحیرۂ روم میں گرنے سے پہلے دریائے نیل کی بہت سی شاخیں ہو جاتی ہیں اور یہ ڈیلٹا کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔ یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو آباد کیا تھا۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے (بنی اسرائیل) اپنے خاندانوں کے ساتھ یہاں آباد ہو گئے اور کئی سو سال میں ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کا مصر سے خروج (Exodus) ہوا اور آلِ فرعون کو غرق کیا گیا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے والے یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ مصر کے جس علاقے میں بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک مقیم رہے اسے بھی وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

فلسطین میں اہم ترین جگہ Temple Mount ہے۔ یہ ایک پہاڑی سی ہے جس کے اوپر ایک مستطیل بنتی ہے جو کہ چاروں طرف سے اٹھی اور اُبھری ہوئی ہموار جگہ ہے اور اس کے اوپر ایک میدان کی شکل بن جاتی ہے۔ اس مستطیل کے اندر مسلمانوں کے دو انتہائی متبرک مقامات ہیں' یعنی جنوبی گوشے میں مسجد اقصیٰ اور شمالی گوشے میں قبۃ الصخریٰ (Dome of the Rock) ہے جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانی سفر (معراج) شروع ہوا تھا۔ دراصل یہ ایک پہاڑی تھی جس پر اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک گنبد تعمیر کروا دیا تھا۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخریٰ ۱۹۶۷ء کی عرب

اسرائیل جنگ سے پہلے اردن کے پاس تھے۔ اُس وقت اردن کے بادشاہ نے اس گنبد پر ۳۰ ٹن سونے کی پتری چڑھائی تھی۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا گنبد ہے۔ اسی وقت یہودی اخبارات نے لکھ دیا تھا کہ جب ہم اس کو گرا کر اپنا تیسرا معبد (Third Temple) تعمیر کریں گے تو یہ سونا اس کی تعمیر میں ہمارے کام آئے گا۔ معبد کی تعمیر کے بعد وہ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت (Throne of David) لا کر رکھنا چاہتے ہیں جو اِس وقت لندن میں پارلیمنٹ سے ملحق گرجا (ویسٹ منسٹر ایبے) میں موجود ہے۔ اس تخت پر حضرت داؤد علیہ السلام اور پھر حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ یہ وہ نکات ہیں جو عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین متفق علیہ ہیں۔ البتہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق جب مذکورہ بالا کام ہو جائیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور اس تخت پر بیٹھ کر حکومت کریں گے۔ اس کے برعکس یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کا ''میسایاح'' (Messiah) جس کے وہ اب تک منتظر ہیں' جب آئے گا تو پورے کرۂ ارض پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ حالانکہ اس ضمن میں جو پیشین گوئیاں تورات میں تھیں ان کے مصداق حضرت مسیحؑ تھے' لیکن جب وہ آئے تو یہودیوں نے انہیں تسلیم نہیں کیا' بلکہ نعوذ باللہ انہیں ولدالزنا' جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔

بہرحال یہودیوں کے مذکورہ بالا پروگرام کو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ خاص طور پر Baptists اور اُن میں سے بھی بالخصوص Evangelists اس مشن میں یہود کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں۔ بلی گراہم (Billy Graham) ان کا ایک بہت بڑا مبلغ اور امیر و وائز رتھا' جو خدا کا سفیر (Ambassador of God) کہلاتا تھا اور سابقہ امریکی صدر بش سینئر اس کا مرید تھا' اور اس وقت موجودہ امریکی صدر بش جونیئر اِس بلی گراہم کے بیٹے (فرینکلن گراہم) کا مرید ہے۔ یہ لوگ (Evangelists) اِس وقت پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں سب سے زیادہ فعّال اور بائبل کی نشر و اشاعت اور تشریح و توضیح کرنے والے ہیں۔ ان کے بعض شعلہ بیان مقررین نے اپنے ریڈیو اور ٹی وی کے ذاتی چینلز کا وسیع جال پھیلایا ہوا ہے۔ The Philadelphia Trumpet ان کا ترجمان رسالہ ہے جو فلاڈلفیا سے نکلتا ہے۔ یہ رسالہ پوپ جان پال ثانی کے بارے میں لکھتا تھا کہ یہ شیطان ہے جو کروسیڈ کی تیاری کر رہا ہے۔

تو یہ ہے وہ آخری صلیبی جنگ جس کے لیے یہ بساط بچھائی جا رہی ہے اور اس کی خبریں دی ہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ رومی (عیسائی) تم پر اَسّی علم لے کر حملہ آور ہوں گے اور اُن میں ہر علم کے نیچے بارہ ہزار فوجی ہوں گے۔ اس ضمن میں یہ امر انتہائی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے کہ موجودہ دَور میں ایک ڈویژن آرمی بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گویا ۸۰ ڈویژن فوج سے حملہ ہوگا جس کے لیے تیاریاں جاری ہیں۔ واضح رہے کہ پہلی صلیبی جنگوں میں عیسائی ایک طرف تھے اور ان کا نشانہ مسلمان اور یہودی تھے' لیکن اب عیسائی اور یہودی ایک ہوں گے اور ان کا نشانہ مسلمان ہوں گے۔ مسلمانوں کو بہت شدید جانی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کی خبریں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں۔ آپ ﷺ نے اس جنگ (الملحمة العظمٰی) کے بارے میں بتایا کہ ایک باپ کے اگر سو بیٹے ہوں گے تو ۹۹ ہلاک ہو جائیں گے' صرف ایک بچے گا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اتنی لاشیں گریں گی کہ پوری زمین پٹ جائے گی۔ ایک پرندہ مسلسل اڑتا چلا جائے گا' لیکن اسے زمین پر بیٹھنے کے لیے خالی جگہ نہیں ملے گی۔ یہ ہے تباہی کا وہ نقشہ جو آخری صلیبی جنگ کے نتیجے میں سامنے آئے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ جنگ اصلاً پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہوئی ہے۔ آج جو صورت حال ہمارے سامنے ہے اس کے مطابق یہودیت اور عیسائیت یک جان ہیں' بلکہ عیسائی یہودیوں کے آلۂ کار بن چکے ہیں۔ لیکن اُمت مسلمہ انتشار کا شکار ہے۔ وحدتِ ملی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ اس سارے تناظر میں مسلمان حکمرانوں کا کردار انتہائی مایوس کن بلکہ شرمناک ہے' خواہ وہ وردی والے ہوں یا بغیر وردی کے' سب کے سب مغربی

تہذیب کے دلدادہ اور امریکہ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی اس کمزوری کی بنا پر امریکہ کا اُن پر شدید دباؤ ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کیا جائے۔ محسوس یہی ہو رہا ہے کہ اس مطالبے پر بالآخر سرِ تسلیم خم ہو جائے گا۔ استنبول میں پاکستانی وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور اسرائیلی وزیر خارجہ شلوم کی pre-arranged ملاقات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جبکہ یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ وہ ایک طرف مسلم ممالک پر قبضہ جمانے اور گریٹر اسرائیل کے قیام کے خواب دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے مقدس مقامات قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اپنے تیسرے معبد کی تعمیر کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہودیوں کے اس اقدام پر جو عظیم خونریزی ہوگی اس کے ہلکے سے تصور سے بھی انسان کانپ جاتا ہے۔ قبۃ الصخرۃ یا مسجد اقصیٰ کے انہدام پر عرب نوجوانوں کے اندر انتہائی جوش و خروش پیدا ہو جائے گا اور وہ بلبلا کر اٹھیں گے۔ اس کے نتیجے میں پہلے تو خود امریکہ کے ایجنٹ مسلم حکمران ان کی سرکوبی کریں گے' جیسے آج ''القاعدہ'' کا نام دے کر پوری مسلم دنیا میں مجاہدین کا قلع قمع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے بعد انتہائی خوفناک جنگ ہوگی جس میں شدید خونریزی ہوگی۔ اس میں مسلمان ایک طرف ہوں گے اور یہود و نصاریٰ دوسری طرف۔

قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جو آیات آئی ہیں' ان میں دو مقامات پر بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ یہ دونوں مقامات سورۃ المائدۃ میں ہیں۔ ایک مقام پر فرمایا گیا:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَھُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَھُمْ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنْھُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُھْبَانًا وَّاَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''تم اہل ایمان کی عداوت میں شدید ترین یہود اور مشرکین کو پاؤ گے' اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب ترین اُن لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے''۔

یہ وہ دَور تھا کہ جب عیسائیوں اور یہود کے درمیان دشمنی چل رہی تھی' اُس وقت عیسائی مسلمانوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نجاشیؒ ایمان لے آئے' اور آپ کو معلوم ہے کہ شہنشاہِ روم ہرقل (Heraclius) خود بھی اس طرح اسلام لانا چاہتا تھا جس طرح اڑھائی تین سو برس پہلے رومی شہنشاہ قسطنطین عیسائی ہوا تو اس کے ساتھ پوری مملکت عیسائی ہوگئی۔ ہرقل چاہتا تھا کہ میں اسلام لے آؤں اور میرے ساتھ میری مملکت بھی اسلام لے آئے' تاکہ میری بادشاہت قائم رہے۔ چنانچہ اس کی بادشاہت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی اور وہ اس سعادت سے محروم رہا۔ میرے نزدیک قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیت اُس دَور کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت وہ ہے جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی تھی:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾﴾

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست (اور ایک دوسرے کے پشت پناہ اور مددگار) ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے' یقیناً اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا''۔

یہ دراصل پیشین گوئی تھی آج کے حالات کے بارے میں۔ ورنہ جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت تو یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید دشمنی تھی۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۳ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ص وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ص ......﴾

''اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے......''

ان کے درمیان ہمیشہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اصحاب الاُخدود عیسائی تھے' جنہیں ایک یہودی بادشاہ نے خندقیں کھود کر اُن میں آگ جلا کر انہیں زندہ جلا ڈالا۔ تو ان کے مابین شدید دشمنی اور عداوت تھی' لیکن اب برعکس صورت حال ہے کہ ان کے مابین شدید دوستی ہے جس کو آپ کہتے ہیں: ''hand in glove'' کہ جیسے ہاتھ کے اوپر دستانہ پہن لیں تو پورا ہاتھ اور دستانہ یکجان ہو جاتے ہیں' اسی طرح آج یہودیت اور عیسائیت یکجان ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اصل حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت یہودیت کے مقاصد پورا کرنے میں اس کا آلۂ کار بن چکی ہے۔ اس صورت حال میں ہمارے لیے راہنمائی سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ میں ہے' جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔ اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط﴾

''تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی (یہود و نصاریٰ) میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں' کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں''۔

دیکھئے یہ آیت عالم اسلام کے موجودہ حکمرانوں پر کس درجے صادق آ رہی ہے! اس وقت عالم اسلام کے اکثر حکمران (جن کے لیے بادشاہ کا لفظ موزوں تر ہے) سب کے سب بش کے پرستار ہیں۔ پرویز مشرف صاحب نے بھی اب بش کے سامنے تیسرا سجدہ کیا ہے۔ انہوں نے پہلا سجدہ کیا تھا جب طالبان کے بارے میں یوٹرن لیا تھا۔ ایک حکومت کو خود سپانسر کیا' اس کی پشت پناہی کی اور اُن کا سفیر ملا ضعیف ابھی اسلام آباد میں موجود تھا' لیکن ان کے خلاف امریکہ کی پوری مدد کی اور انہیں تہس نہس کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ صدر مشرف کا دوسرا سجدہ کشمیر کے مسئلے پر یوٹرن تھا۔ ہمارا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ پہلے مسئلہ کشمیر پر بات ہوگی' پھر کوئی اور بات ہوگی۔ چنانچہ واجپائی کے دَور میں صدر مشرف صاحب گردن اکڑا کر دہلی سے واپس چلے آئے تھے کہ پہلے کشمیر کی بات ہوگی' پہلے کشمیر کا مسئلہ حل کرو' اس کے بعد پھر کوئی بات ہوگی۔ اب اس ایشو پر بھی ہم نے سجدۂ سہو کر لیا اور ہم لچک پر لچک دکھائے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی طرف سے ایک لچک بھی نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی' ہندوستان کی سرحد ہندوستان کی سرحد ہے اور کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔

اب ہمارے صدر صاحب نے تیسرا سجدہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں کیا ہے۔ اسرائیل کے بارے میں ہمارا ہمیشہ سے یہ موقف تھا کہ ہم ہرگز اسے تسلیم نہیں کریں گے' چاہے عرب تسلیم بھی کر لیں۔ بانئ پاکستان نے اسرائیل کو مغربی دنیا کی ناجائز (illegitimate) اولاد قرار دیا تھا' اور اگر عرب مجبوراً ایک ناجائز ملک کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں تو ضروری تو نہیں کہ ہم بھی مجبوری کے تحت اسے قبول کریں۔ لیکن اب یہ صورت حال زیادہ دُور معلوم نہیں ہو رہی کہ یہ تیسرا سجدہ مکمل ہو جائے گا اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہمارے اپنے ملک کے اندر کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو حکومتی اقدامات کو چیلنج کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قابل ذکر جماعتیں تھیں تو وہ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام تھیں۔ ان دونوں کے پاؤں میں ڈیڑھ صوبائی حکومتیں دے کر بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور انہیں ان کے اندر مگن کر دیا گیا ہے۔ اب وہ صدر مشرف کے خلاف کوئی سٹینڈ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بہرحال اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم نے قرآنی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے بش کو تیسری مرتبہ سجدہ کر لیا ہے اور

عیسائیوں کے بعد اب ہم یہودیوں سے بھی دوستی کے لیے بے تاب نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ قائداعظم نے جو اِس ملک کے بانی و مؤسس ہیں' دوٹوک انداز میں اسرائیل کو مغربی قوتوں کا حرامی بچہ قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اسے ہم کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی طرح ہمارے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان جب امریکہ گئے تھے تو انہیں وہاں یہودیوں کی طرف سے بہت بڑا reception دیا گیا' جس میں اسرائیل کو تسلیم کر لینے کی صورت میں طرح طرح کے لالچ دیے گئے۔ لیکن ان کے جواب میں خان لیاقت علی خان مرحوم نے کہا تھا (اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے)

"Gentlemen, our souls are not for sale."

''حضرات! ہماری روحیں بکاؤ مال نہیں ہیں''۔

آپ یہ قیمت دے کر' لالچ دے کر ہمیں ایک غلط کام پر آمادہ نہیں کر سکتے' ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس واقعے کو ۵۵ برس ہو چکے ہیں اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہماری حکومت اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ باقاعدہ ریاستی تعلقات کے قیام کی راہ پر گامزن ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہود و نصاریٰ کی دوستی ہمارے لیے کبھی نفع بخش نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں قرآنی ہدایت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے:

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا رفیق کبھی نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور جو کوئی ان سے رشتۂ ولایت استوار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔''

یہ تھی وہ ساری صورتحال جس کا ایک جائزہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ آخری صلیبی جنگ کے معاملات کس طرح قدم بقدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں ہمیں امریکہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی بجائے اپنے مالکِ حقیقی سے نصرت و اعانت کا طلب گار ہونا چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات